

## خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات

سید جلال الدین عمری

۲۰-۲۱ نومبر ۲۰۰۹ء کو ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے زیر اہتمام خاندانی نظام اور قرآنی تعلیمات کے مرکزی موضوع پر ایک سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں راقم کو کلیدی خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مصروفیات کی بنا پر پہلے سے مقالہ کو ضبط تحریر میں نہ لایا جاسکا۔ ضروری نوٹس کی روشنی میں سمینار میں زبانی طور پر جو کچھ عرض کیا گیا اسے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس پر نظر ثانی اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (جلال الدین)

### خاندان اجتماعی زندگی کا اولین ادارہ

ہم سب جانتے ہیں کہ انسان اجتماعیت پسند ہے۔ اس کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ سماج میں رہنا پسند کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ضروریات کا بھی تقاضا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ تنہا اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ بہت سے افراد مل کر اس کی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ خاندان اس اجتماعی زندگی کا اولین اور اساسی ادارہ ہے۔ یہیں سے اجتماعیت کا آغاز ہوتا ہے اور بہت سے خاندان مل کر سماج کی تشکیل کرتے ہیں۔

سماجیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ خاندان مختلف قسم کے رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ چھوٹے اور اوسط درجے کے خاندان بھی رہے ہیں اور نسبتاً بڑے خاندان بھی پائے گئے ہیں۔ چھوٹے خاندان میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس میں ماں باپ اور بہت ہی قریبی رشتہ دار بھی بسا اوقات شامل ہوتے ہیں۔ بعض خاندان مشترک

ہوتے ہیں جو کئی خاندانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کا نظم کبھی الگ الگ اور کبھی مشترک ہوتا ہے۔

اسلام نے نظام خاندان کو مستحکم کیا ہے

اسلام نے خاندان کے اساسی ادارے کو باقی رکھا اور اس میں خدائی ہدایات سے محرومی، نفسانی خواہشات کے دخل یا ظلم و زیادتی کی وجہ سے جو بہت سی خرابیاں در آئی تھیں ان کو دور کیا۔ قرآن مجید میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ وہ کیا خرابیاں ہیں؟ اور ان کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟ اس نے نظام خاندان میں پائی جانے والی خامیوں ہی کو دور نہیں کیا، بلکہ خاندان کا ایک تفصیلی نقشہ پیش کیا کہ خاندان کس طرح کا ہونا چاہیے؟ اس میں مسائل پیدا ہوں تو انھیں کس طرح حل کیا جانا چاہیے؟ اس سے خاندان کے فطری تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور عدل و انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں۔ وہ ایک صحت مند معاشرے کے لیے خاندان کو لازمی قرار دیتا ہے۔ کوئی بھی دور ہو اور کیسے ہی حالات ہوں، وہ اسے ایک مستقل اور ابدی ادارے کی حیثیت سے باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے اخلاق اور قانون دونوں سے مدد لی ہے۔ وہ مختلف طریقوں سے اس ادارہ کو مستحکم کرتا اور مضبوط بناتا ہے۔

رہبانیت اور آوارگی کے درمیان راہِ اعتدال

خاندان کا آغاز مرد اور عورت کے صنفی تعلق سے ہوتا ہے۔ اس تعلق کے سلسلہ میں ایک تو رہبانیت کا نقطہ نظر ہے کہ یہ انسان کی روحانی ترقی میں مانع ہے۔ جو کوئی روحانی مدارج طے کرنا چاہتا ہے اسے اس سے دامن کش رہنا چاہیے۔ دوسرا نقطہ نظر مطلق اباحت یا بے قید جنسی خواہش کی تکمیل کا ہے۔ رہبانیت تو شاید آہستہ آہستہ دم توڑ چکی ہے، لیکن جنسی آوارگی کا راستہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ اسلام نے اعتدال کی راہ دکھائی۔ اس نے کہا کہ یہ ایک فطری ضرورت ہے، لیکن اس کی تکمیل کی بعض مخصوص شرائط ہی کے ساتھ اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے اس نے نکاح کی شرط رکھی ہے کہ

نکاح کے ذریعے ہی آدمی اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کر سکتا ہے۔ یہ جائز ہی نہیں بلکہ کارِ ثواب ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہر نیک کام میں ثواب ہے۔ اس ضمن میں آپ نے فرمایا: وفی بضع احدکم صدقة (تمہارے جنسی عمل میں بھی ثواب ہے) اس پر صحابہ کرام نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول، ایک آدمی اپنی خواہش پوری کرتا ہے تو کیا اس میں بھی اسے ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا:

أرايتم لو وضعها في حرام أكان  
عليه فيها وزر؟ فكذلك اذا  
وضعها في الحلال كان له اجرٌ۔  
”تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر وہ اپنی اس  
خواہش کو غلط طریقے سے پوری کرتا تو کیا  
اسے گناہ نہ ہوتا؟! اسی طرح اگر وہ اسے صحیح  
طریقے سے پوری کر رہا ہے تو اس پر وہ اجر کا  
مستحق ہے“

اسی طرح اسلام نے یہ بھی کہا کہ اس فطری جذبے کو ختم کرنا صحیح نہیں ہے۔ صحابہ کرام میں سے بعض کا رجحان تھا کہ رہبانیت اختیار کر لیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

لارهبانية في الاسلام اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

یہ روایت اگرچہ سند کے اعتبار سے کم زور ہے، لیکن جو بات اس میں کہی گئی ہے وہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ صحابہ کرام میں سے بعض لوگوں نے سوچا کہ خصی کروالیں، تاکہ جنسی خواہش ہی کا خاتمہ ہو جائے، آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا:

انی لم اومر بالرهبانية ۲ مجھے رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

## مقصد نکاح

اسلام میں نکاح کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعے آدمی عفت و عصمت کی زندگی

گزار سکتا اور غلط کاموں سے بچ سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

۱ صحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف

۲ سنن الدارمی، کتاب النکاح، باب النهی عن التبتل

یا معشر الشباب من استطاع منکم

”اے نوجوانو، تم میں سے جو شخص شادی کی

الباءة فليتزوّج! استطاعت رکھتا ہے اسے شادی کر لینی چاہیے“

فقہائے کرام نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی کے بدکاری میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور اسے حج درپیش ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے شادی کرے اور بعد میں حج کو جائے، کیوں کہ حج کو مؤخر کیا جاسکتا ہے، لیکن نکاح کو مؤخر کرنے سے بدکاری میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔

اسی حدیث میں آگے ہے:

ومن لم يستطع فعلیه بالصوم، فانه

”اور جو شادی کی استطاعت نہ رکھتا ہو اسے

لہ و جاء . چاہیے کہ روزہ رکھے۔ اس طرح اس کی

جنسی خواہش قابو میں رہے گی“

ظاہر ہے اگر آدمی خوب کھائے گا یا عیش و عشرت کی زندگی گزارے گا تو اس کے جذبات اسی لحاظ سے متحرک ہوں گے، اس لیے ان پر کنٹرول کرنے کے لیے طریقہ یہ بتایا گیا کہ وہ روزہ رکھے۔ کھانے پر کنٹرول ہو تو اس جذبے پر بھی کنٹرول ہوگا۔ بدکاری سے بچنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ آدمی عیش کی زندگی نہ گزارے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ محرمات (وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے) کا تذکرہ کرنے کے

بعد کہا گیا ہے:

وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ

۔ (النساء: ۲۴)

مطلب یہ کہ یہ محرمات ہیں، ان سے شادی نہیں ہو سکتی۔ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے

مہر ادا کر کے نکاح ہو سکتا ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ تم باعفت زندگی گزارو اور بدکاری سے بچو۔

۱ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من لم يستطع الباءة فليصم، صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت

نفسہ... الخ

عربی زبان میں 'حصن' قلعہ کو کہتے ہیں۔ محصنین کا مطلب یہ ہے کہ اس قلعہ میں داخل ہو جاؤ۔ اس میں آنے کے بعد تم پر بدکاری کے حملے نہیں ہو سکتے۔ یعنی جو شخص بھی اس قلعہ کے اندر آ جائے گا وہ محفوظ ہو جائے گا۔ اسی طرح سفح عربی زبان میں اس روش کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے جنسی جذبات کے پیچھے بے تحاشا دوڑنے لگے۔ جہاں شادی کا حکم دیا گیا وہیں اس کی یہ مصلحت بتائی گئی کہ اس کے ذریعے تمہاری عفت کی حفاظت ہوگی اور تم بدکاری اور اس کے نتائج بد سے بچ سکو گے۔

زوجین ایک دوسرے کے لیے باعثِ سکون ہیں

قرآن نکاح کے تعلق کو الفت و محبت کا تعلق قرار دیتا ہے۔ یہ محبت فطری اور دوطرفہ ہوتی ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے زندگی کی تلخی اور بے کلی دور ہوتی اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ آدمی کسی اجنبی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ بسا اوقات پہلے سے اس سے کوئی جان پہچان نہیں ہوتی، لیکن نکاح ہوتے ہی ان کے درمیان محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تو قدرت کی نشانی ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ  
أَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ  
مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ  
لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ - (الروم: ۲۱)

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم ہی میں سے جوڑے بنائے، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

اس آیت میں نکاح کا ایک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعے زوجین کو سکون حاصل ہو، دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ اس کے ذریعے زوجین کے دلوں میں محبت پیدا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت دونوں طرف سے ہونی چاہیے۔ اگر وہ یک طرفہ ہوگی تو دیر تک نہیں چلے گی۔ جہاں تک سکون کا تعلق ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی کی ہماہمی، اضطراب اور بے چینی میں آدمی کو گھر میں اور وہ بھی

بیوی ہی کے ذریعہ سکون مل سکتا ہے۔ اسی طرح بیوی کے لیے شوہر ہی وجہ سکون ہے۔ آج انسان سکون کا متلاشی ہے اور دنیاوی ترقی کے باوجود وہ جس چیز سے محروم ہے وہ سکون ہی ہے۔ قرآن نے بتایا کہ اگر تم سکون چاہتے ہو تو ازدواجی زندگی گزارو۔ وہ کہتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بڑی نشانیاں ہیں کہ دو اجنبی انسان ایک دوسرے کے لیے کس طرح وجہ سکون بن جاتے ہیں۔

قرآن نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ تمہارے اس تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ اس نے

کہا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ - ”عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو“  
(البقرہ: ۱۸۷)

اس آیت کی معنویت پر ہم جتنا غور کریں گے اتنے ہی نئے نئے پہلو ہمارے سامنے آتے جائیں گے اور ہم حیرت میں پڑ جائیں گے کہ قرآن مجید نے کتنی عمدہ اور بامعنی تعبیر استعمال کی ہے۔ انسان کا لباس اس کے جسم کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس سے قریب کوئی دوسری چیز نہیں ہوتی۔ قرآن نے کہا: تم عورتوں کا لباس ہو اور وہ تمہارا لباس ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان جو قربت ہوتی ہے اس کے لیے اس سے بہتر اور کوئی مثال نہیں دی جاسکتی۔ لباس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے جسمانی عیوب کو ڈھانپ دیتا ہے۔ جسم کے جس حصہ پر لباس ہوتا ہے وہاں اگر کوئی پھوڑا پھنسی ہے، یا کوئی اور خرابی ہے تو لباس ان سب کو چھپا دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ تم بیوی کا لباس ہو اور بیوی تمہارا لباس ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے پردہ پوش ہیں۔

اسلام نے خاندان کا سربراہ مرد کو بنایا ہے

اسلام نے خاندان کی تعمیر میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا، لیکن گھر اور خاندان کا سربراہ مرد کو قرار دیا۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا ادارہ ہو، بغیر ذمہ دار کے چل نہیں سکتا۔ اس سے وابستہ جتنے افراد ہوں سب اپنا حکم چلانا چاہیں تو ممکن نہیں کہ اس پر عمل

ہوسکے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ مرد اور عورت دونوں مل کر خاندان کی تعمیر کریں گے، لیکن اس میں ذمہ دار مرد ہوگا:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا  
فَصَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا  
أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ - (النساء: ۳۴)

”مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ  
نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی  
ہے اور اس بنا پر کہ انھوں نے اپنے مال خرچ  
کیے ہیں۔“

نظام خاندان میں مرد کو ذمہ دار بنانے کی آیت میں دو وجہیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو جسمانی، ذہنی اور دیگر پہلوؤں سے عورت کے مقابلے میں زیادہ صلاحیتیں دی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس پر عورت کی مالی ذمہ داری ہے۔ اس کی وجہ بھی اس کی قوت و صلاحیت ہی ہے۔ ایک شخص قوی اور طاقت ور ہے اور دوسرا کم زور، تو طاقت ور شخص کے لیے ضروری ہے کہ کم زور کا بوجھ برداشت کرے۔ قرآن نے کہا کہ مرد نسبتاً مضبوط اور عورت اس کے مقابلے میں کم زور ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس پر اپنا پیسہ خرچ کرے اور اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ یہ ایک عام اصول ہے۔ استثنائی شکلیں بہت سی ہوسکتی ہیں۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت مرد کے مقابلے میں مضبوط ہو، باصلاحیت ہو اور صاحبِ ثروت بھی ہو۔ یہ سب امکانات ہیں، لیکن عمومی بات یہ کہی گئی ہے کہ خاندان کا سربراہ مرد ہوگا۔ اس میں اصلاً قوت و صلاحیت اور ذمہ داریوں کا اعتبار کیا گیا ہے۔ مرد کو اس معاملہ میں ترجیح حاصل ہے اس لیے کہا گیا کہ گھر کے نظام میں اسے قوام کی حیثیت حاصل ہوگی۔

نظام خاندان اسی وقت بہتر طریقہ سے چل سکتا ہے جب مرد کی اس حیثیت کو عورت قبول کرے اور خوش دلی سے اس کی اطاعت کرے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

فَالصَّالِحَاتُ قَنَاطٌ حَفِظَتْ لِلْغَيْبِ بِمَا  
حَفِظَ اللَّهُ - (النساء: ۳۴)

”پس نیک عورتیں شوہر کی اطاعت شعار ہوتی  
ہیں۔ حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں ان کے  
پچھے کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔“

’قنوت‘ کے معنی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں۔ قانات کا مطلب یہ ہے کہ

نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں۔ اللہ کے احکام کی بھی اور شوہر کی ہدایات کی بھی۔ بما حفظ اللہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ نے چوں کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے، مردوں کو مطلق اقتدار نہیں دیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ ان کی اطاعت گزار ہوں، اس اندیشہ میں مبتلا نہ ہوں کہ شوہروں کی اطاعت کی وجہ سے ان کے حقوق ضائع ہو جائیں گے۔

## عورت کو ظلم اور نا انصافی سے بچانے کی تدابیر

اقتدار کے ساتھ ظلم و زیادتی اور نا انصافی کا امکان بہ ہر حال رہتا ہے۔ مردوں کو اگر اقتدار دیا گیا ہے تو ان کی جانب سے ظلم و زیادتی کے امکان کو روکنے کے لیے دو اقدامات کیے گئے۔ ایک یہ کہ انھیں تعلیم دی گئی کہ عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کریں۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

”اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق رہن  
سہن رکھو، پس اگر تم انھیں ناپسند کرتے ہو تو  
ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے  
اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔“

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن  
كُرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا  
وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء: ۱۹)

معروف سے مراد یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر بہتر سلوک کا جو تصور اور معیار ہے اس کے مطابق عورتوں کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ معروف زمانہ اور حالات کے لحاظ سے بھی بدلتا رہے گا۔ میاں بیوی کے حالات کے لحاظ سے بدلے گا، آدمی جس ماحول اور جس ملک میں رہ رہا ہے اس کے لحاظ سے بھی بدلے گا۔ لیکن سلوک ایسا ہونا چاہیے کہ اسے عرف عام میں بہتر سلوک سمجھا جاتا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ہو سکتا ہے عورت کی بعض باتیں تمہارے لیے ناگواری کا باعث ہوں، تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس سلسلے میں اس سے بڑی بات شاید کہی بھی نہیں جاسکتی۔ عورت کی کچھ باتیں طبعی طور پر شوہر کو ناگوار ہو سکتی ہیں، کبھی اس کا سلوک غلط ہو سکتا ہے، اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ ہو سکتی ہے، اس کی جانب سے کبھی غصہ اور کبھی بدزبانی کا اظہار ہو سکتا ہے، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ شوہر نے کوئی بات کہی، لیکن بیوی نے نہ مانی۔ قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ ان کم زوریوں



کے باوجود تمہارا سلوک عورت کے ساتھ معروف کے مطابق ہونا چاہیے۔ علماء کرام کہتے ہیں کہ آیت کے نکلنے (اور اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو) میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تمہیں ایسی اولاد عطا کر سکتا ہے جو تمہارے دل کو خوش کر دے، جو علم، تقویٰ اور نیکی کے لحاظ سے بہتر ہو۔ اس وقت تم بھول جاؤ گے کہ اس کی ماں کا تمہارے ساتھ کیا معاملہ تھا۔

عورتوں کے ساتھ صرف حسن سلوک ہی کی تعلیم نہیں دی گئی، بلکہ ان کے قانونی حقوق بھی متعین کیے گئے۔ اس سلسلے میں قرآن نے کہا:

”اور عورتوں کے لیے کچھ حقوق ہیں، جس  
طرح ان پر کچھ ذمہ داریاں ہیں، دستور کے  
(البقرہ: ۲۲۸)  
مطابق۔“

یعنی عورتوں کی ذمہ داریاں بھی ہیں اور ان کے حقوق بھی ہیں۔ شوہروں کو یہ دیکھنے کا حق ہے کہ بیویاں اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں یا نہیں؟ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ان کے حقوق ادا ہو رہے ہیں یا نہیں؟ قرآن مجید نے عورت کے حقوق اور ذمہ داریاں دونوں ہی کا ذکر کیا ہے۔ ازدواجی زندگی میں جہاں یہ دیکھا جائے گا کہ عورت ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے یا نہیں وہاں اس کے حقوق بھی ادا کیے جاتے رہیں گے۔

ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت

اسلام نے مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ عرب میں اس کا رواج تھا۔ لوگ کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ دوسرے مذاہب اور دوسرے ملکوں میں بھی جو لوگ صاحب ثروت ہوتے تھے ان کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھی، اس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسلام نے کہا کہ آدمی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ یہ بات جنگی پس منظر میں کہی گئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جوان مرد بالعموم ختم ہو جاتے ہیں۔ اُس دور کی جنگوں میں اس کا زیادہ امکان تھا۔ اس لیے اگر ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی لگادی جاتی تو بیوہ ہوجانے والی عورتیں بے شوہر

کے رہ جاتیں۔ اسلام نے اس کا حل یہ تجویز کیا کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اسے اس نے جنگی حالات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ عام رکھا۔ اس لیے کہ فرد کو بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ چنانچہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اس حکم کا تعلق صرف حالت جنگ سے نہیں ہے، بلکہ عام حالات میں بھی آدمی ضرورت محسوس کرے تو ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے۔ البتہ قرآن نے اس کے لیے دو شرطیں رکھیں۔ ایک یہ کہ آدمی بہ یک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ دوسری شرط یہ رکھی کہ ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان کے درمیان عدل کے تقاضے لازماً پورے کرنے ہوں گے۔ ارشاد ہے:

”اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم تیبیوں کے معاملہ میں انصاف نہیں کر سکو گے تو نکاح کرو ان عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں، دو، تین، چار۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو یا جو تمہاری ملک بیمین میں ہوں۔ اس طرح امید ہے کہ تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔“

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ  
فَأَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ  
مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبْعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا  
تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ  
أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا -  
(النساء: ۳)

یہاں قرآن کا یہ بیان بڑا اہم ہے کہ اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو تمہیں ایک ہی بیوی رکھنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شادی سے پہلے آدمی اپنے حالات اور اپنے وسائل و ذرائع کا جائزہ لے۔ اس میں جسمانی طاقت اور مالی وسائل دونوں ہی شامل ہیں۔ اپنی عمر کا اور ہونے والی اولاد، ان کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا جائزہ لے، اس کے بعد اگر وہ یہ اندیشہ محسوس کرتا ہے کہ وہ انصاف نہیں کر سکے گا تو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے سے احتراز کرے۔ اس پابندی سے ظلم و زیادتی سے بچا جاسکتا ہے۔ اسلامی شریعت کی رو سے اس کی بھی گنجائش ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں عدل کے تقاضے پورے نہ ہوں اور ان میں سے کسی کی حق تلفی ہو رہی ہو تو وہ قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہے۔

## اگر ازدواجی تعلقات خراب ہونے لگیں

ازدواجی تعلقات خراب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تعلقات خراب ہونے لگیں تو آدمی صبر و ضبط سے کام لے اور حکمت و تدبیر اور افہام و تفہیم کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش کرے۔ اس مقصد سے وہ کسی حد تک بیوی کے ساتھ سختی بھی کر سکتا ہے، اس سے تجاوز کی اسے اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح مرد کے اندر کوئی خرابی ہے تو عورت اس کی اصلاح کی مناسب انداز میں کوشش کرے۔ اس کے باوجود اس کا امکان ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو جائے کہ اسے وہ خود رفع نہ کر سکیں۔ اس صورت میں قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ دونوں طرف سے ایک ایک شخص کو حکم بنایا جائے اور وہ افہام و تفہیم کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش کریں۔ جوانی میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے، بہت سی نامناسب باتیں ہو جاتی ہیں، کبھی کبھی دونوں خاندان کے لوگ اپنی ناستحبی سے حالات کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اگر اخلاص کے ساتھ کوشش ہو تو اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے۔ ارشاد ہے:

”اگر تمہیں ڈر ہو دونوں میں اختلاف اور ضد اور ہٹ دھرمی کا تو ایک حکم مرد کی طرف سے اور ایک حکم عورت کی طرف سے بھیجو۔ اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں تو اللہ میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔“

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا  
حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِنَّ  
يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقُ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ  
اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا۔ (النساء: ۳۵)

اس آیت میں ”يُرِيدَا“ کی ضمیر زوجین کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اگر زوجین اصلاح کے خواہش مند ہوں گے تو اللہ ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد دونوں حکم ہیں کہ اگر وہ معاملہ کو سلجھانا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔

اس ارشاد باری تعالیٰ کا تعلق بہ ظاہر دونوں خاندانوں سے ہے کہ ان کے ذمہ دار

اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کا مخاطب مسلم معاشرہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو وہ بھی حکم متعین کر سکتی ہے۔ لیکن ان کی کوشش اصلاح حال کی ہوگی۔ وہ فریقین کو مشورہ دے سکتے ہیں، کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، فیصلہ کا حق زوجین ہی کو ہوگا۔ بہر حال یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔

## طلاق کی گنجائش

اصلاح حال کی کوشش کے بعد بھی میاں بیوی کے لیے ازدواجی رشتے کو باقی رکھنا اور ایک ساتھ چلنا دشوار ہو جائے تو اسلام نے مرد کے لیے طلاق کا اور عورت کے لیے خلع کا راستہ رکھا ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تعلقات کتنے ہی بگڑ جائیں، عورت اور مرد کی زندگی کتنی ہی اجیرن کیوں نہ ہو جائے، طلاق نہیں ہو سکتی، یا عورت خلع نہیں حاصل کر سکتی۔

اہل عرب میں طلاق کی کوئی حد نہیں تھی۔ آدمی جب چاہتا طلاق دے دیتا اور جب چاہتا رجوع کر لیتا۔ اس طرح وہ عورت کو زندگی بھر تک کر سکتا تھا۔ قرآن نے کہا کہ طلاق کا حق، جس میں عدت کے دوران رجوع کیا جاسکتا ہے، دو مرتبہ ہے:

”طلاق دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد آدمی یا تو  
 معروف کے مطابق روک لے یا بھلے  
 طریقے سے چھوڑ دے۔“

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ  
 أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ۔ (البقرہ: ۲۲۹)

آیت میں طلاق رجعی کا ذکر ہے۔ آدمی کو صرف دو مرتبہ یکے بعد دیگرے طلاق کا حق حاصل ہے۔ اس سے وہ (عدت میں جو تین حیض یا تین ماہ ہے) رجوع کر سکتا ہے۔ حکم ہے کہ رجوع کر لے تو بیوی کے ساتھ معروف کے مطابق معاملہ کرے اور علیحدگی کا فیصلہ کرے تو بہتر طریقہ سے علیحدہ کرے۔ عدت کا زمانہ گزر جائے اور رجوع نہ کرے تو از سر نو نکاح کرنا پڑے گا۔ تیسری مرتبہ طلاق دے تو رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا۔ دوبارہ وہ اس عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا چاہے تو اس کے لیے طویل راستہ رکھا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

”پھر اگر وہ اسے (تیسری مرتبہ) طلاق دے دے تو اب وہ اس کے لیے حلال نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر لے۔“ (اور اس کے ساتھ مجامعت بھی ہو جائے)

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔ (البقرة: ۲۳۰)

اگر کسی عورت کو طلاق دے دی گئی تو اسے دوسری شادی سے منع نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر تین طلاقیں ہو گئیں تو اب وہ زندگی بھر گھر بیٹھی رہے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ عدت گزرنے کے بعد وہ دوسری شادی کر سکتی ہے، اس کے بعد اگر اس کا شوہر مر جائے یا اسے طلاق دے دے (اس میں دس بیس سال بھی لگ سکتے ہیں اور مہینہ دو مہینے میں بھی یہ بات ہو سکتی ہے) تو ماضی کے تجربہ کے بعد اور ان حالات سے گزرنے کے بعد اس کا سابق شوہر چاہے اور عورت خود بھی چاہے تو ان کے درمیان از سر نو نکاح ہو سکتا ہے۔ یہ مشکل طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ آدمی طلاق اور رجوع کو مذاق نہ سمجھ لے اور تیسری مرتبہ طلاق دینے سے پہلے ہزار بار سوچ لے کہ پھر بیوی سے تعلق آسان نہ ہوگا۔

### تین طلاقوں کا مسئلہ

حدیث میں طلاق وقفہ وقفہ سے حالت طہر میں دینے کا حکم ہے۔ سنت کا طریقہ یہی ہے کہ ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد آدمی عدت گزرنے دے، تاکہ اگر آئندہ ضرورت محسوس ہو تو ان کے درمیان از سر نو نکاح ہو سکے۔ صحابہ کرام کا عمل اسی پر تھا۔ مرد نے عورت کو ایک طلاق دی اور چھوڑ دیا۔ اس طرح زوجین کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ پھر عدت گزرنے کے بعد اگر وہ دوبارہ اس عورت سے شادی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ تمام فقہائے کرام کا اس پر اتفاق ہے۔ البتہ ایک سوال یہ زیر بحث رہا ہے کہ اگر کسی نے یہ ترتیب باقی نہیں رکھی اور ایک ہی مرتبہ تینوں طلاقیں دے دیں تو کیا اس کا حق طلاق ختم ہو گیا؟ اب وہ رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟ عام فقہاء کہتے ہیں کہ شوہر کو تین طلاقوں کا حق دیا گیا تھا، اگر اس نے ایک ہی موقع پر ان کا استعمال کر لیا تو انھیں تین ہی

سمجھا جائے گا، لیکن بعض دوسرے علماء کہتے ہیں کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس نے ایک نشست میں تین تین نہیں، تین سو طلاقیں بھی دے دیں تو انھیں ایک ہی شمار کیا جائے گا اور اسے رجوع کا حق ہوگا۔ لیکن اس سے کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا، طلاق بہر حال ہو جاتی ہے، تین مرتبہ ہو یا ایک مرتبہ۔ یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ اگر کسی نے تین بار طلاق دے دی تو طلاق نہیں ہوگی۔ سب کہتے ہیں کہ طلاق ہو جائے گی۔ اختلاف اس میں ہے کہ ایک ہوگی یا تین؟ یہ ایک قانونی بحث ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی طلاق دینا چاہتا ہے تو وہ آج بھی دے گا، کل بھی دے گا اور پرسوں بھی دے گا۔ اس سلسلے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک مجلس میں تین بار طلاق طلاق تاکید کے طور پر کہے اور اس کی مراد صرف ایک ہو تو اس کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔

اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ماں باپ دونوں کی ہے

اسلامی قانون کی رؤ سے اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے، وہی اس کا ولی اور کفیل ہوتا ہے اور اس کی معاشی ذمہ داری اٹھاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اولاد ماں کی طرف منسوب نہیں ہوگی۔ یہ قانونی بات اور ہے، لیکن اولاد ماں کی طرف بھی منسوب ہو سکتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فلاں عورت کی اولاد ہے۔ تو غلط نہ ہوگا۔ قرآن مجید نے اولاد کی نسبت باپ اور ماں دونوں کی طرف کی ہے۔ ارشاد ہے:

”اور مائیں اپنی اولاد کو دو سال تک دودھ پلائیں یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہے اور جس کی اولاد ہے وہ ان کے کھانے کپڑے کا بندوبست کرے دستور کے مطابق، کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا جائے گا۔ نہ ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے، نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے۔“

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ  
كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ  
وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ  
بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا  
وُسْعَهَا لَا تَضَارَّ الْوَالِدَةُ بِوَالِدِهَا وَلَا  
مَوْلُودٌ لَهُ بِوَالِدِهِ۔ (البقرة: ۲۳۳)

اس آیت میں بچے کو ماں کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے اور باپ کی طرف بھی۔ قانونی اعتبار سے نفقہ باپ کی ذمہ داری ہے، لیکن ماں کی طرف بھی اولاد کی نسبت ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں عمران کی بیوی، جو حضرت مریم کی والدہ تھیں، کی نذر کا ذکر ہے:

إِذْ قَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (آل عمران: ۳۵)

”یاد کرو وہ وقت جب عمران کی بیوی نے کہا تھا: اے میرے رب میں نے نذر مانی ہے کہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ تیرے دین کے لیے وقف ہوگی تو اسے قبول کر لے۔ بے شک تو سننے والا اور جاننے والا ہے“

اس آیت کے ذیل میں مشہور حنفی فقیہ علامہ ابو بکر جصاص رازی کہتے ہیں:

”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کو اولاد کی تادیب، تعلیم، دین کی راہ میں لگانے، اور اس کی تربیت کے سلسلے میں ایک طرح کی ولایت حاصل ہے۔ وہ سرپرست بن سکتی ہے۔

ورنہ وہ (عمران کی بیوی) اس کی نذر نہ مانتیں۔ اسی طرح اسے اس کا بھی حق ہے کہ اگر باپ نام نہ رکھے تو وہ اپنی اولاد کا نام رکھے۔ صحیح نام ہوگا۔“

اولاد کا نان نفقہ برداشت کرنا اور اس کے لیے جدوجہد کرنا باپ کی ذمہ داری ہے:

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ (البقرة: ۲۳۳)

”اور جس کی اولاد ہے وہ ان (مطلقہ بیویوں) کے کھانے کپڑے کا بندوبست کرے دستور کے مطابق“

اسی طرح ان کی صحیح تعلیم و تربیت بھی ماں باپ کے فرائض میں داخل ہے۔ ماں باپ کو اس کا

عملاً نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ وہ انھیں جہنم سے بچانے کی فکر کریں اور خود بھی جہنم سے بچیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ  
وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ (التحریم: ۶)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے  
آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے“

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ خود آگ سے بچو اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ بیوی بچوں کو بھی جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے قبل خود کو نمونہ بنا چاہیے اور اپنے گھر کو نمونہ بنا نا چاہیے۔ اگر گھر نمونہ نہیں بنے گا تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ بات قرآن میں ازواجِ مطہرات کو خطاب کر کے کہی گئی ہے:

وَأذْكُرَنَّ مَا يَتْلُوا فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ  
آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ۔ (الاحزاب: ۳۴)

”اور یاد رکھو جو کچھ تمہارے گھروں میں اللہ  
کی آیات اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں۔“

اس آیت میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہمارے گھروں کو دعوت و تبلیغ کا مرکز ہونا چاہیے۔

## قتلِ اولاد کی کسی صورت میں اجازت نہیں

قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ حق حیات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اس حق کو کوئی سلب نہیں کر سکتا۔ ماں باپ بھی اولاد سے حق حیات نہیں چھین سکتے۔ یہ ایک قانونی جرم ہے۔ یہ بات قرآن میں بہت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ عرب میں غربت و افلاس اور بعض دوسرے اسباب سے قتلِ اولاد کے واقعات ہوتے تھے۔ قرآن نے کہا:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ  
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (الانعام: ۱۵۱)

”اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو فقر کی بنا پر، ہم  
تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی

دیں گے۔“

کبھی افلاس سے زیادہ اندیشہ افلاس سے قتلِ اولاد کا ارتکاب ہوتا تھا۔ قرآن نے اس سے

بھی منع کیا:



اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو فقرو فاقہ کے اندیشے سے۔ ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ ان کا قتل بہت بڑی خطا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشِيَةَ إِمْلَاقٍ  
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ  
خِطْءًا كَبِيرًا۔ (الاسراء: ۳۱)

قتل اولاد کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے قرآن نے اسے بے علمی اور جہالت کی حرکت اور فرد اور قوم کا خسارہ کہا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا  
بَغْيِرِ عِلْمٍ۔ (الانعام: ۱۴۰)

قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو قتل کر دے۔ یہ اپنی بے وقوفی سے جو اقدام کر رہے ہیں اس میں ان کا اپنا نقصان ہے، اس سے نسل تباہ ہوتی ہے اور قوم کی افرادی قوت ختم ہوتی ہے۔ یہ تو خسارہ کا سودا ہے۔ انھیں خود سوچنا چاہیے۔

## والدین کے حقوق

قرآن مجید میں اولاد کے سلسلے میں جہاں ماں باپ کی ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں وہیں اولاد کو بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کی تکمیل کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔  
”اور ان دونوں کے ساتھ رہو دنیا میں  
معروف کے مطابق“ (لقمان: ۱۵)

معروف کے مطابق معاملہ کرنے کے حکم میں ان کا نان نفقہ اور ضروریات کی تکمیل بھی شامل ہے۔ اس میں محض قانونی ذمہ داریاں ادا کرنے ہی کا نہیں بلکہ ان کے ادب و احترام، ان کے ساتھ حسن سلوک، ان کے حق میں دعا اور ہر ممکن خدمت کے باوجود کوتاہی کے اعتراف کا حکم ہے۔ خاص طور پر ان کی پیرانہ سالی میں، جب وہ اولاد کے زیادہ دست نگر ہوتے ہیں اور مزاج میں ایک طرح کا چڑچڑاپن آجاتا ہے، ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے:

”اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو ان سے اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور کہو اے میرے رب ان دونوں پر رحم کر جس طرح انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی۔“

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ  
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ إِمَّا يَبُلُغَنَّ  
عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا  
فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آفٌ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ  
لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. ۚ وَخَفِضْ لَهُمَا  
جَنَاحَ الدُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ  
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا -  
(الاسراء: ۲۳-۲۴)

اس سلسلے میں موجودہ دور میں ایک سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اسلامی تعلیمات کی رؤ سے Old age home کی کچھ گنجائش ہے؟ میرے خیال میں اولڈ ایج ہوم کا تصور قرآن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اِمَّا يَبُلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ (اگر وہ تمہارے پاس رہتے ہوئے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں) سے اشارہ ملتا ہے کہ والدین کو ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن آج کے حالات میں بسا اوقات والدین کو ساتھ رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ کبھی بیوی کی وجہ سے، کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہے، یا شوہر کا اس پر کنٹرول نہیں ہے، یا آج کل ماں باپ ہندوستان میں ہیں اور بیٹا امریکہ یا برطانیہ میں رہ رہا ہے، یا سعودی عرب یا کسی دوسرے ملک میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس طرح کی اور دشواریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی مادی ضروریات کے ساتھ ان کی دل جوئی کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ اب اس کے لیے آدمی کیا طریقہ اختیار کرے اس کا تعین تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہر آدمی خود سوچ سکتا ہے کہ اس صورت حال میں اسے کیا کرنا چاہیے؟۔

خونی رشتوں کا احترام

ماں باپ، بیوی بچوں کے ساتھ قرآن نے خونی رشتوں کے بھی احترام کا حکم دیا ہے:

”وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ- (النساء: ۱)“  
 ”اور ڈرو اللہ سے جن کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قطع رحمی سے بچو“

اہل ایمان کے جو اوصاف مذکور ہیں ان میں سے ایک صلہ رحمی بھی ہے:

”وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ- (الرعد: ۲۱)“  
 ”اور وہ جوڑتے ہیں اسے جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے“

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ صرف وعظ و نصیحت نہیں ہے، بلکہ تائیدی حکم ہے:

”وَأْتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تَبْذُرْ تَبْذِيرًا- (الاسراء: ۲۶)“  
 ”اور رشتے دار کو اس کا حق دواور مسکین اور مسافر کو اس کا حق اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ“

اس آیت میں بڑی اہم بات بتائی گئی ہے کہ فضول خرچی کرو گے، دولت کو ادھر ادھر اڑانے

لگو گے تو قرابت داروں اور دوسرے مستحقین کا حق ادا نہیں ہوگا۔ یہ حق اسی وقت ادا ہوگا جب دولت کے صرف پر کنٹرول رکھو گے اور اہل حق کا حق پہچانو گے۔

## خلاصہ بحث

اسلام نے خاندان کا جو نظام پیش کیا ہے وہ ایک مربوط نظام ہے۔ اس نے محبت و اخلاص اور

راخلاق و قانون کی بنیاد پر اسے استوار کیا ہے۔ معاشرہ خاندانوں کا مجموعہ ہوتا ہے، خاندان کے

دائرے میں اسلامی احکام کی پابندی ہوگی تو پورے معاشرے پر اس کے اثرات پڑیں گے۔ اسلام نے

جس طرح خاندان کو پاکیزہ رخ عطا کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ماحول کے عمومی فساد سے مسلمانوں کے

خاندان آج بھی کسی حد تک محفوظ ہیں۔ پورے معاشرے پر ہمارا کنٹرول نہیں ہے۔ لیکن خاندان کے

چھوٹے سے دائرے میں ہمیں جو اقتدار اور تصرف حاصل ہے اس سے اگر ہم پورا فائدہ اٹھائیں اور

خاندان کو اسلامی رخ دے سکیں تو ان شاء اللہ پورا سماج اس سے متاثر ہوگا اور اسلام کے اثرات ہر

طرف نظر آنے لگیں گے۔

## اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

- ۱- مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
- ۲- نوعیت اشاعت: سہ ماہی
- ۳- پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری
- ۴- قومیت: ہندوستانی
- پتہ: دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
- ۵- ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،
- پتہ: دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
- ۶- ملکیت: ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی،
- پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
- بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی
- ۱- مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)
- دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
- ۲- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکرٹری)
- سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرز، سول لائنس، علی گڑھ
- ۳- ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)
- شعبہ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
- ۴- ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)
- الریحان۔ منزل منزل، علی گڑھ (یو پی)
- ۵- مولانا محمد فاروق خاں (رکن)
- ۱۳۵۳- بازار چٹلی قبر، دہلی-۶
- ۶- ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی (رکن)
- فریدی ہاؤس، سر سید نگر، علی گڑھ (یو پی)
- ۷- مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی (رکن)
- دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی، ۲۵
- ۸- جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)
- مالاٹھن کنڈی ہاؤس، بیلیری، کالی کٹ
- ۹- ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)
- طارق منزل، بریا تو ہاؤسنگ کالونی، رانچی
- ۱۰- جناب محمد جعفر (رکن)
- دعوت نگر، ابو الفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
- ۱۱- انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)
- حیدرآباد
- مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔
- پبلشر
- سید جلال الدین عمری